اصلاحِ حال کی جانب

تقلید محض سے مبنی بر اقدار اسلامی قانون اور فقہ کی طرف پیش رفت

TOWARD *our Reformation* • FROM LEGALISM *to* VALUE-ORIENTED ISLAMIC LAW *and* JURISPRUDENCE

محمد عمر فاروق

IIIT Books-In-Brief Series

اصلاحِ حال کی جانب

تقلید محض سے مبنی بر اقدار اسلامی قانون اور فقہ کی طرف پیش رفت

مصنف

محمد عمر فاروق

تلخیص: وانڈا کراوز

مترجم

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

اِنسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی ۲۵

© IIIT, 1444 AH / 2023 CE
IIIT, P.O. Box 669, Herndon, VA 20172, USA • www.iiit.org
P.O. Box 126, Richmond, Surrey TW9 2UD, UK • www.iiituk.com

اس کتاب کے حقوق محفوظ ہیں۔قانونی ضوابط اور متعلقہ اجتماعی لائسنس معاہدوں کی دفعات کے تحت اس کتاب کے کسی حصے کو ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر دوبارہ شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ISBN: 978-93-80946-39-9

کتاب میں پیش کیے گئے خیالات کا ناشر کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔کوئی تیسرا شخص کتاب کو ویب سائٹ یا کسی اور ذریعے سے عام کرتا ہے،تو اس کے مصدرِ اصلی کے مطابق ہونے کی ذمہ داری ناشر کی نہیں ہے۔

اصلاحِ حال کی جانب: تقلید محض سے مبنی بر اقدار اسلامی قانون اور فقہ کی طرف پیش رفت
(اردو)
Islah-e-Hal Ki Janib: Taqleed-e-Mahaz Se Mabni Bar Iqdar Islami
Qanoon Aur Fiqh Ki Taraf Pesh Raft
محمد عمر فاروق
مترجم: پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

اصل کتاب Toward our Reformation: From Legalism to Value-Oriented Islamic Law and Jurisprudence کا ترجمہ
آئی آئی آئی ٹی کی مختصر کتابوں کا سلسلہ
اصل انگریزی کتاب آئی آئی آئی ٹی سے ۲۰۱۵ میں شائع ہوئی۔
ہندستان میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز،نئی دہلی سے پہلے اردو ترجمے کا سالِ اشاعت ۲۰۲۳

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز
162، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
email: ios.newdelhi@gmail.com / www.iosworld.org

تقسیم کار

الاتحاد پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
B-35، نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-110013
Tel.: +91-11-41827475, 24352732, 24352048
email: alittehad@gmail.com

قیمت:-/50

فہرست

آئی آئی آئی ٹی مختصر کتب کا سلسلہ ۵

پیش لفظ ۷

باب اول: تعارف ۹

باب دوم: شریعت، قانون اور قرآن: تقلید محض بہ مقابلہ اقداریت ۱۳

اقدار پر مرکوز توجہ ۱۸

۱۔ بنیادی انسانی احترام ۱۸

۲۔ عدل وانصاف ۱۹

۳۔ مساوات اور غیر جانب داری ۱۹

۴۔ آزادی ۱۹

۵۔ آفاقی اخلاقی تعلیمات (معروف) ۱۹

۶۔ انسانیت اور عالمی اخوت ۲۰

۷۔ شورائیت ۲۰

۸۔ قانون کی بالادستی ۲۱

۹۔ باہمی خیر کے لیے اشتراک ۲۱

۱۰۔ بہ طور اصول تشدد پر پابندی ۲۱

۱۱۔ دوسروں کے انجام پر فیصلے سے بچنا ۲۱

۱۲۔ ظاہری صورت کے بہ جائے اصل پر توجہ ۲۲

۱۳۔ زندگی کے تجربات کو اجتماعی اکتساب کا حصہ تسلیم کرنا ۲۲

باب سوم: اسلامی قانون میں حدیث کا مناسب اور بے جا استعمال ۲۳
باب چہارم: نظریۂ اجماع: کیا اتفاق رائے پایا جاتا ہے؟ ۲۹
باب پنجم: قیاس اور اسلامی قانون کے بعض مشکل مسائل ۳۳
باب ششم: اسلامی فقہ اور نظر انداز کردہ تجرباتی بنیاد ۳۷
باب ہفتم: اختتامیہ: اصلاح حال کی جانب ۴۱

❖❖❖

آئی آئی آئی ٹی مختصر کتب کا سلسلہ

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی مختصر کتابوں کا یہ سلسلہ ادارے کی اہم اشاعتوں کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے، جنھیں خلاصے کی شکل میں اس لیے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کو اصل کتاب کے اہم مضامین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہو جائے۔ مختصر، پڑھنے میں آسان اور وقت کو بچانے والی یہ اجمالی تحریریں دراصل بڑی بڑی کتابوں کے انتہائی موزوں اور احتیاط سے تحریر کردہ خلاصے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتابچے قارئین کو اصل کتاب کے مطالعے پر ابھاریں گے۔

اس تصنیف ''اصلاحِ حال کی جانب: تقلید محض سے مبنی بر اقدار اسلامی قانون اور فقہ کی طرف پیش رفت'' میں مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا اصل سبب بنیادی اسلامی اقدار سے ان کی ناواقفیت اور دوری ہے۔ مصنف محمد عمر فاروق نے ایسے طرز فکر کی حمایت کی ہے، جس میں ساری اہمیت اعلیٰ اقدار کی ہے۔ آج ہم جس کو شریعت سمجھتے ہیں، وہ علم الکلام کی آرا اور اس کے نتیجوں کا ایک پیچیدہ، تہہ دار اور پراسرار مجموعہ ہے، جس سے درحقیقت مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔ مصنف کی دلیل ہے کہ کم زور احادیث اور قانون حدود کا غلط اور بے جا اطلاق روح قرآن اور سنت نبوی کے خلاف ہے، جس کے نتیجے میں مسلمان مطعون ہو رہے ہیں۔ مصنف نے قانون حدود کے غلط اطلاق اور اس کے نتیجے میں ہونے والی بدنامی کو واضح کیا ہے۔

اس تصنیف میں چھ ابواب ہیں۔ پہلا باب بہ طور تعارف ہے۔ دوسرے باب میں شریعت اور اس اصطلاح سے متعلق غلط فہمیوں پر گفتگو ہے اور تقلید کا ذکر ہے۔ باب سوم میں

حدیث زیر بحث ہے اور یہ بعض اہم معاملات سے متعلق ہے۔ قوانین بنانے میں حدیث کے بے جا استعمال کی نشان دہی کی گئی ہے۔ باب چہارم اجماع سے متعلق ہے۔ مصنف کے مطابق اجماع سے متعلق زیادہ تر دعوے بے بنیاد اور نا قابل عمل ہیں اور اجماع کے تمام پہلوؤں پر اتفاق رائے نہیں پایا جاتا، اس لحاظ سے اجماع کا جائزہ بہ طور فقہ اسلامی کا ماخذ لیا گیا ہے۔ باب پنجم میں قیاس پر توجہ مرکوز ہے اور اسلامی قانون کے بنانے میں اس کے غلط استعمال کے نظری پہلوؤں پر تنقید ہے۔ باب ششم میں اس نکتے پر اصرار ہے کہ آج پھر اسلامی قانون میں توازن اور اعتدال کے لیے تجرباتی بنیاد لازم ہے۔ متن پر گفتگو کے دوران آج کی زندگی کے معاملات اور مسائل بھی پیش نظر رہنے چاہییں۔ مصنف کے بہ قول: مسلم دنیا کے حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتے، جب تک کہ بنیادی مآخذِ اسلام کے بارے میں مسلمانوں کی فکر اور سمجھ میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

محمد عمر فاروق کی درج ذیل اصل کتاب کا مختصر ایڈیشن:

TOWARD OUR REFORMATION: FROM LEGALISM TO VALUE-ORIENTED ISLAMIC LAW AND JURISPRUDENCE
ISBN hbk: 978-1-56564-372-7
ISBN pbk: 978-1-56564-371-0
2011

پیش لفظ

یورپ کے صنعتی انقلاب نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا۔ اس سے فرد بھی متاثر ہوا اور معاشرہ بھی۔ ایک طرف نئے نئے مسائل سامنے آئے تو دوسری طرف انسانی زندگی مشینی زندگی میں تبدیل ہوگئی۔ عام انسان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں بچا کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالے اور پیش آمدہ مسائل پر غور و فکر کرے۔ لیکن اس صورت حال کے نتیجے میں جدید مسائل کے انبار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ روز بہ روز ایک نیا مسئلہ سر اٹھاتا اور اہل علم کو دعوتِ فکر و تحقیق دیتا رہا۔ الحمد للہ اہل علم نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا۔ نئے مسائل کو فکر اسلامی کے تناظر میں حل کرنے کی شان دار کوششیں کیں اور بڑے اہم موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں علمی و فکری مواد پیش کیا۔ گویا دریا کو کوزے میں سمو دیا، تاکہ ہر صاحبِ علم کے لیے ان سے استفادہ آسان ہو جائے۔

زیر نظر کتابچہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں عہد حاضر کے ایک سلگتے ہوئے موضوع پر بڑے علمی و فکری انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ موضوع کے تمام علمی گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے مصنف نے پوری مضبوطی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے، تاکہ موضوع کی اہمیت واضح ہو۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آئیں اور عصری تناظر میں اس کو فکر و تحقیق کا موضوع بنانے کی راہ ہم وار ہو۔

ہمیں امید ہے کہ مختصر کتابوں کا یہ پورا سلسلہ وقت کے بہت سے اہم موضوعات پر علمی و تحقیقی مطالعے کی راہ ہم وار کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی

باب اول

تعارف

لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی دل چسپی کے موضوع کے بارے میں جملہ معلومات انھیں دی جائیں۔ اسلام میں واقفیت حاصل کرنے، تعلیم پانے، تحقیق کرنے، رائے قائم کرنے اور باخبر ہونے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے تنقیدی شعور پر عمل کریں اور محض اندھی پیروی نہ کریں۔ اسلام آباء واجداد کی تقلید کی مخالفت کرتا ہے اور ان کے اعمال اور رسم و رواج پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے کو غلط ٹھہراتا ہے۔ قرآن کا اصرار ہے کہ ایمان علم اور سمجھ کی بنیاد پر ہے۔ اس بارے میں رسول اکرمؐ کی ہدایات واضح ہیں۔ آپؐ نے طلبِ علم کی ہر ممکن ہمت افزائی کی۔ درحقیقت تمام مذکور فرائض اور واجبات میں صرف طلبِ علم کے لیے فرض کی متعین اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

اکثر تعلیم یافتہ مسلمان یہ جانتے ہیں کہ قانون اسلامی کے چار بنیادی مآخذ ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ پوری اسلامی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ علما و فضلا نے کھلے ذہن کے ساتھ سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ سوال کریں کہ یہی اسلامی روایت ہے۔

تاہم گزرتے وقت کے ساتھ فضلا آزادانہ غور و فکر سے کترانے لگے، منہج کی محدودیت کے سبب اس میں اور بھی اضافہ ہوگیا اور صدیوں تک یہی سلسلہ جاری رہا اور صورت حال خراب ہوتی گئی۔ داخلی و خارجی اثرات کے سبب اسلامی تہذیب پر زوال آیا۔ مقابلے کی دنیا اور مخالف ماحول کے باعث زوال میں اضافہ ہوا اور مغربی تہذیب نے

غلبہ حاصل کرلیا۔ مغربی قوتوں نے مسلم ممالک اور دیگر ممالک کو استعماریت کے شکنجے میں جکڑا اور مغربی قوانین اور ضابطۂ حیات کا قبضہ اسلامی قانونی اداروں اور طرز حیات پر قائم ہوگیا۔

صورت حال میں مزید خرابی اس احیائی جوش وخروش کے باعث پیدا ہوئی ہے، جس کی انتہا عوام پر شریعت کو تھوپنا ہے اور اسے غلطی سے اسلامی قانون پر عمل سمجھا جاتا ہے۔ وہ ممالک، جن میں مذہبی قانون پر عمل نہیں ہے، ان میں بھی عام ثقافت اور معاشرت پر اسلامی قانون کا غلبہ ہے۔

یہ مقام عبرت ہے کہ جہاں گزشتہ صدیوں میں فکر اور عقل پر توجہ مرکوز رہی، ان ہی مسلم ممالک میں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ بنیادی اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں گے اور دوسروں کو بھی علم اور فہم کی دعوت دیں گے، لیکن ان ہی کے ہاں علم وفہم مفقود ہے۔ اس المیے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عام مسلمانوں میں تنقیدی شعور نہیں ہے۔ وہ صحیح انداز میں غور وفکر اور عقلی بنیاد پر فیصلے نہیں کرتے ہیں۔ بنیادی ماخذ کے منہج محدود ہونے کا جائزہ اس تصنیف میں لیا گیا ہے کہ روایتی طور پر یہی منہج استعمال میں ہے۔

اس آئینے میں جو عکس نظر آتا ہے اور ہماری اصلاح کا جو بھی نقشہ تجویز ہو، اس سے قطع نظر ہمیں ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے: ۱) بہ طور انسان ہمارے اندر اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ قرآن نے جابجا تاکید کی ہے کہ اس تبدیلی کا عمل ہمارے اندر ہونا چاہیے اور خود ہمیں اپنے آپ کو تبدیل کرنا چاہیے (الرعد: ۱۱)۔ ۲) قرآن اور سنت میں دی گئی متوازن اور جامع ہدایت ہماری رہ نما ہونی چاہیے، اسی کی رہبری میں ہم تمام مسائل پر قابو پاسکتے ہیں۔ ۳) اصلاح کے جذبے سے سرشار یہ ہمارا مقصد ہونا چاہیے کہ ہم دنیا میں مثبت تبدیلی لائیں۔

اس کتاب کا مقصد عام مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ وہ اسلامی تناظر میں اپنے

درپیش مسائل کی سمجھ حاصل کریں، اپنے آپ کو قرآن اور سنت نبوی سے زیادہ قریب کریں اور امت کے لیے بہتر طریقہ تلاش کریں، تاکہ وہ انسانیت کی خدمت کریں۔ اس کتاب میں مناظراتی موضوعات کو نہیں نمایاں کیا گیا ہے، بل کہ مسلم دنیا کو درپیش حقیقی مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً غریبی، محرومی، جہالت، کم زوری، آمریت، استحصال، ناانصافی، معاشی عدم مساوات، تشدد، حقوق انسانی کی خلاف ورزی، حقوق نسواں کی پامالی، ٹیکنالوجی اور معاشی میدانوں میں پس ماندگی اور مغرب پر انحصار وغیرہ۔ مسلم دنیا کی صورت حال روشن نہیں ہے۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہے اور اس کا حل بھی ہے۔

یہ تصنیف قانون اسلامی اور فقہ کا بے لاگ تجزیہ ہے۔ یہ ایسا تناظر فراہم کرتی ہے، جس میں صدیوں سے محفوظ ہمارے علمی ورثے کے لیے احترام پایا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تصنیف کا تعلق مستقبل سے بھی ہے۔ اس کا مقصود ایسی گفتگو ہے، جس کی مدد سے روشن مستقبل سامنے آئے۔

باب دوم

شریعت، قانون اور قرآن: تقلید محض بہ مقابلہ اقداریت

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ قرآن اور سنت پر مبنی حقیقی شریعت جس کا صحابہ نے فہم حاصل کیا تھا، وہ آج علمی آرا اور کلامی بحث کے بوجھ تلے دب گئی اور کم زور ہوگئی ہے۔ صدیوں سے اس میں ذاتی آرا کا اضافہ ہوتا رہا اور اب افسانوں کے پردے میں کہیں چھپ کر رہ گئی ہے۔[1] محمد اسد نے اپنے مذکورہ بالا جملوں میں حقیقی شریعت کی موجودگی کے بارے میں سوال اٹھایا ہے۔ شریعت کی سمجھ اور تقلید محض کی جانب میلانات ایسے موضوعات ہیں، جن پر بحث اور تحقیق ہوئی اور اس میدان میں اقدار اور اصولوں پر بھی بحث ومباحثے کی ضرورت ہے۔ آج انسانی تہذیب و تمدن کا مرکز مسلم دنیا سے مکمل طور پر منتقل ہوکر مغرب میں مرکوز ہوگیا ہے۔ دوسری جانب بہت سے مسلم اکثریتی ممالک روایتی اسلام کی جانب مائل ہیں اور شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ملک اس سمت میں جتنا زیادہ آگے بڑھتا ہے تو اس پر مغرب سے زیادہ، دنیا بھر کے فرض شناس مسلمان پریشان ہوجاتے ہیں۔[2] اس کے علاوہ مسلم دنیا اور مغرب میں بہت سے مسلمان اس رجحان سے مایوس، بے چین اور مشتعل ہیں۔ موجودہ صورت حال میں یہ سوال اٹھانا لازم ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے اور شریعت کے تصور سے آج کی دنیا پر کیا اثر پڑے گا؟

غلط تصور، غلط فہمی، غلط اطلاق یا غلط استعمال کے باعث کوئی بھی تصور خراب ہوسکتا ہے۔ شریعت کے صرف ایک حصے پر عمل کے لیے بعض آمریت پسند، موروثی حکم راں ذمے دار رہے ہیں۔ انھوں نے بالعموم اس کو زیادہ تر غریب عوام پر تھوپا ہے، جب کہ دولت مند اور برسر اقتدار طبقے شریعت کی سخت سزاؤں سے محفوظ رہے ہیں۔ شریعت کے نام پر عام طور سے قانون حدود پر عمل ہوتا ہے، جس میں زبردستی قرآن اور سنت کی شرعی سزائیں دی جاتی ہیں۔

دراصل یہ سب دھوکہ ہے اور اسلام کے انصاف اور برابری کی روح کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً زنا کے لیے جو حدود قانون ہے، اس کے نتیجے میں زنا بالجبر کا شکار بے گناہ خواتین بھی قید ہوئیں اور ان کے لیے سزائے موت کا بھی امکان ہے۔ (۳)

تاہم محض شریعت کو چھوڑنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، اس کے غلط استعمال کو سامنے لایا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ عقیدہ اور نصب العین ان دعووں کی معقول تصدیق کرے۔ اس باب کا مرکزی نکتہ ہی اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اسلام اور شریعت کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ دور جدید کے بعض معاملات کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا گیا ہے۔

فضلا (جو مسلم فکر کا علم رکھتے ہیں)، صحافی اور لیڈر اکثر شریعت اور اسلامی قانون کو ایک مانتے ہیں۔ اس کے پیچھے لوگوں کی عملی کاوش اور ان کی اپنی سوچ ہے، اس بارے میں وہ ماضی سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ اس کا ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ کلاسیکی اسلامی علمی روایت کے آخری دور میں شریعت کی اصطلاح کا بغیر کسی تشریح کے اس غلط فہمی کے زیر اثر استعمال کیا جاتا رہا کہ یہ اصطلاح معروف ہے اور اس کے معنیٰ سب پر روشن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کلاسیکی دور میں بھی اس کو صاف بیان نہیں کیا گیا اور شریعت کی اصطلاح صرف جدید دور میں اتنی زیادہ مقبول ہوئی ہے۔

شریعت کو بالعموم الٰہی سمجھا جاتا ہے۔ لغت کے مطابق الٰہی سے مراد خدا سے تعلق یا راست خدا سے ملنے والی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شریعت راست خدا کی طرف سے آئی ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ ہم شریعت سے کیا مطلب لیتے ہیں؟ (۴) اگر شریعت فقہ کے معنیٰ میں ہے تو یہ یقیناً اللہ کی نازل کی ہوئی نہیں ہے۔ فقہ یا اسلامی قانون بڑی حد تک انسانی کوشش کا نام ہے۔ بہ طور اصول قرآن یقیناً اللہ کی طرف سے ہے، لیکن دیگر مآخذ مثلاً حدیث، اجماع اور قیاس اللہ نے نازل نہیں کیے ہیں۔ غرض یہ کہ شریعت کے وہ پہلو، جو اللہ کی ہدایت سے نہیں، بل کہ اس سے کم تر مآخذ یعنی حدیث (۵) اور انسانی کوشش مثلاً اجماع اور قیاس سے متعلق ہیں، وہ اللہ کی وحی کا حصہ نہیں ہیں۔

شریعت کے بارے میں عام تصور ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ تاہم اس

طرح کے بیانات بے بنیاد، جذباتی اور محض دعوے ہیں۔ اس خیال کے مطابق شریعت تاریخی لحاظ سے عقائد اور قوانین کا ایسا مجموعہ ہے، جس کو بدلا نہیں جاسکتا، جب کہ شریعت ایسی نہیں ہے، کیوں کہ مختلف پیغمبروں کی رہ نمائی میں اس میں تبدیلیاں ہوئیں۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانے میں۔ بعض روایت پسند حضرات نے شریعت کو ایسا الوہی مقام دے دیا ہے، جس کو بدلا نہیں جاسکتا اور اکثر فقہا کی رائے میں شریعت کا بڑا حصہ تبدیل ہوسکتا ہے۔ تبدیلی کا انحصار حالات پر ہے۔ مشہور اصول ہے کہ احکام وقت اور مقام کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ (٦)

شریعت کے بارے میں ایک عام تصور یہ بھی ہے کہ یہ بھی اسلام کی طرح اور مکمل نظام زندگی ہے۔ بہت سے علمائے اسلام نے اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے بہ قول: اسلام میں ہر مسئلے کا حل ہے اور یہ ہر صورت حال یا ہر مسئلے کا بھرپور جواب ہے۔ اسی خیال میں یہ نکتہ بھی چھپا ہے کہ اسلام ایک خود مکتفی اور مکمل نظام زندگی ہے، اس لیے مسلمانوں کو کہیں اور حل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت اسلام کوئی ایسا ہدایت نامہ نہیں ہے، جس میں مسلمانوں کو درپیش تمام عصری مسئلوں کا حل موجود ہے۔ یہ بیان بالکل غیر معقول ہے۔ کیوں کہ اگر سب مسائل کا حل موجود ہوتا اور آسانی سے تلاش کرلیا جاتا تو مسلم دنیا کی حالت اتنی خراب اور افسوس ناک نہ ہوتی۔ مسلم فکر کی بنیادی خامی دراصل مقدس کتابوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہے۔ اسی ضد کے باعث اسلامی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔ اسلام کوئی لغت کی طرح نہیں، درحقیقت یہ حروف تہجی کی طرح ہے، جو زبان کے مرکبات کی تشکیل کرتے ہیں۔ لغت میں بہت سے الفاظ ہوتے ہیں، لیکن جو الفاظ اس میں فی الحال موجود نہیں ہیں، وہ بھی انھی حروف تہجی سے بنیں گے۔

شریعت کو عام طور پر قانون بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ شریعت اور اسلامی قانون کو یکساں سمجھنا دراصل اسلام کو سمجھنے میں شدید غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اگر شریعت زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق ہے تو لازماً یہ محض قانون سے متعلق نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر وضو، نماز اور روزہ

وغیرہ قانونی معاملات نہیں ہیں۔ اسلامی ہدایات کے ہر پہلو کو قانون سمجھ لینا، اسلام کے ساتھ ناانصافی ہے۔ احکام سے متعلق قرآنی آیات صرف چند ہیں اور وہ کل قرآن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں، لیکن تقلیدی رجحان کے زیر اثر کل قرآن کو محض مجموعۂ قوانین سمجھا جاتا ہے۔ ہر چیز کو ایک قانونی معاملے میں تبدیل کر دینے سے انسانی زندگی پر اس شدت پسندی کا بوجھ پڑ جاتا ہے اور یہ فکر انسان کی فطرت کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن انسان سے بڑے گناہوں سے بچنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کے بندے چھوٹے گناہوں کو معمولی سمجھیں، لیکن ہر معاملے کو صرف قانون کا حصہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔

عام طور پر کسی امتیاز کے بغیر شریعت کو اس کے پورے دائرے کے ساتھ نافذ کیا جاتا ہے، یعنی معاملہ خواہ نماز کا ہو یا جرائم کا۔ شریعت پر عمل کا ذکر نفاذِ قوانین کے حوالے سے کیا جاتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو حدود و قوانین ہیں۔ قرآن نے بعض جرائم مثلاً قتل، زنا اور چوری کے لیے سزائیں مقرر کی ہیں۔ شریعت کو اسلامی قانون سے ملا دینا ایک غلطی ہے۔ کیوں کہ اسلام صرف قانون ہی تک محدود نہیں، بل کہ اس کا تعلق اقدار، اصولوں اور رسوم و رواج سے ہے۔ لہٰذا اسلام کی تمام تعلیمات کو قانون کے ذریعے نہیں تھوپا جا سکتا۔ اللہ نے نماز اور روزے تک کو بھی تھوپنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ اسلام کا مقصود معاشرے کو پولیس ریاست بنانا نہیں ہے، تاکہ ان احکام پر عمل ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے آنے کا مقصد ایک پیغام کو پہنچانا تھا۔ رسول اکرمؐ لوگوں کے معاملات پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا ان کے جاں نشیں اس بارے میں رسول اکرمؐ سے زیادہ نمایاں کردار نہیں ادا کر سکتے۔

شریعت کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہ زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں واضح ہدایات فراہم کرتی ہے۔ یہ تصور سادہ لوحی کو ظاہر کرتا ہے۔ احکام کے باب میں قرآن کے بیانات واضح اور دوٹوک ہیں۔ البتہ ان احکام پر عمل کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر اس ضمن میں سختی کی جائے تو مقاصد اسلام پورے نہیں ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثال غور و فکر کے لیے ہے:

پاکستان میں ایک فوجی آمر نے حدود قوانین کا نفاذ کیا۔ اس کے نتیجے میں زنا بالجبر کی شکار خواتین کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ شریعت کے نام پر ایک گھناؤنے جرم کے شکار اُن مظلوموں کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ (۷)

اس کی ایک دوسری مثال مسلم معاشروں میں مرد کو یک طرفہ من مانی اور بغیر کسی ضابطے کے طلاق دینے کا اختیار ہے۔ وہ ایک ہی نشست میں بیوی کو تین طلاقیں دے کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کا تجویز کردہ طریقۂ طلاق انتہائی دانش مندانہ اور انصاف پر مبنی ہے اور وہ مرد اور عورت دونوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن شریعت کے نام پر غیر اسلامی طریقوں کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ تقلید محض کے ان طریقوں کو زیادہ تر علما نے جائز کر رکھا ہے۔

تقلید محض سے مراد اللہ کی رحمت اور شفقت کو نظر انداز کرتے ہوئے قوانین اور ضوابط تشکیل دینا ہے۔ رسول اکرمؐ کے بعد مسلم معاشروں میں ضابط پرستی کا رواج ہوا ہے۔ ہر معاملے کے بارے میں قوانین بنا دیے گئے ہیں۔ ہر کام کو غلط یا صحیح یا حرام یا حلال قرار دے دیا گیا۔ ضابطہ پرستی کے نام پر لوگ تقوے کا دعویٰ کرتے ہیں، جب کہ ان کا اصل مقصد دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے باعث سماج میں ایسا ماحول پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مستقل فکر مند رہتے ہیں اور معمولی باتوں پر بھی فقہی موشگافیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اللہ کا یہ مقصود نہیں کہ دنیا بالکل مثالی بن جائے۔ اہم تر نکتہ خالق کائنات سے انسان کے رشتے کو مضبوط بنانے میں مدد دینا ہے۔

قرآن میں احکام صرف چند ہی ملتے ہیں، جب کہ قرآن کا بڑا حصہ ہدایات پر مشتمل ہے۔ رسول اکرمؐ نے اقدار کو فروغ دیا تھا تو قانون موجود تھا، لیکن ضابطہ پرستی نہیں تھی۔ اسلام کتاب پر منحصر عقیدے کا نظام نہیں ہے۔ اسلامی فقہ کے میدان میں اقدار کی اہمیت ضروری ہے۔ مقاصد شریعت سے متعلق کتابوں میں دین، زندگی، خاندانی نظام، عقل اور مال کی بقا اور حفاظت کو مقاصد شریعت میں شامل کیا گیا ہے۔ (۸)

اقدار پر مبنی یہ خیال زیادہ جامع ہے۔ بعض حضرات کے مطابق یہ مقاصد اقدار ہی کے نمائندہ ہیں۔ مقاصد شریعت کے روایتی نظام میں شامل بعض دوسرے عناصر یعنی زندگی، خاندان عقل اور جائداد ان سب کو عقیدے کے ماتحت ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اقدار پر مبنی فقہ کے بہ شمول اجتہاد کے بنیادی طریقہ ہائے کار نصوص پر مبنی ہونے چاہییں۔ اس سلسلے میں اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ تخلیقی اور تعمیری ذہن کی تشکیل ہو اور اخلاقی اور دینی باتیں بالکل واضح ہوں۔ توجہ مسائل کے حل پر رہنی چاہیے اور قرآن سے ماخوذ اقدار اور سنت نبوی کا ورثہ اس طرز فکر پر حاوی ہونا چاہیے۔ اس طرح مسلمان اپنے فرائض بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل ہوں گے۔ وہ انسانیت کی بہتر خدمت اور سب سے بڑھ کر اپنے رحیم و کریم رب کی بندگی کر سکیں گے۔

اقدار پر مرکوز توجہ

کسی بھی معاشرے کا اصل کردار اس کی اقدار اور اصولوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی قانونی نظام اور ماحول بھی انھی اقدار اور اصولوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر قانون کو اقدار سے غیر متعلق اور برتر مان لیا جائے تو اس سے اندھی تقلید کا رجحان پروان چڑھتا ہے، اس صورت میں ترجیحات کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ خان مسلمانوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ ''وہ اسلام کو اقدار کا ایک منبع سمجھیں، جو ان کے کردار کو بناتے ہیں، نہ کہ مسائل کے تیار حل مان لیں۔''[۹] سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ بنیادی اقدار کیا ہیں، جن پر مسلمانوں کو عمل کرنا چاہیے اور اپنی فکر میں سمونا چاہیے اور یہ ان کی ثقافت اور قانونی نظام میں بھی شامل ہونا چاہیے؟ درج ذیل فہرست اسی کی تفصیل ہے، گو کہ یہ تمام اقدار کو بیان نہیں کرتی:

۱۔ بنیادی انسانی احترام (ہر انسان ایک شخصیت ہے، نہ کہ کوئی شے):

اللہ نے ہم میں سے ہر شخص کی بہ طور انسان عزت کی ہے۔ مسلمانوں کو اپنی اور دوسروں کی عزت کے تحفظ و بقا میں آگے آگے میں ہونا چاہیے۔ (النساء:۱)

۲۔عدل وانصاف:

عدل وانصاف کے بارے میں اسلام کا نظریہ بے لاگ ہے۔کسی بھی نظریے یا مذہب کے مقابلے میں اس معاملے میں اسلام کا معیار بہت بلند ہے۔اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حق وانصاف کے لیے کھڑے ہوں،خواہ اس میں ان کا اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔(النساء:۱۳۵)

۳۔ مساوات اور غیر جانب داری:

اقدار پر مبنی اسلام کا نظریہ بھرپور برابری کا ہے،اس کا تعلق خواہ مسلم سے ہو یا غیر مسلم سے،عورت سے یا مرد سے،سیاہ فام یا سفید فام سے ہو۔دنیا میں تمام انسان اپنی جان،مال اور جائداد کے حقوق کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔اللہ آخرت میں مسلمانوں کو ان کی خوبیوں کے حساب سے ثواب عطا کرے گا۔البتہ انسانی سطح پر ہر شخص برابر ہے۔

۴۔ آزادی:

اسلام آزادیِ انتخاب کے اصول کا قائل ہے۔اقدار پر مبنی طرز فکر میں زبردستی کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔آج اگر اسلام کو مرکزی مقام حاصل کرنا ہے تو ہم کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ عقیدے کے انتخاب میں آزادی ہونی چاہیے۔جب رسول اکرمؐ اور صحابہ اپنے عقیدے کی بنیاد پر ظلم وستم کا شکار تھے،اللہ نے آزادیِ انتخاب کے پہلو کو نمایاں کیا۔کسی بھی صحت مند سماج کے لیے آزادی بنیادی صفت ہے اور کسی کو یہ بنیادی حق چھیننے کا اختیار نہیں ہے۔آزادیِ انتخاب اور زبردستی کے معاملے میں اسلامی ریاست کا بہت اہم کردار ہے۔اسلامی قانون اور اس کے بے جا استعمال یا سیاسی اقتدار کو مذہبی اقتدار کے ساتھ گڈ مڈ کر دینے کے باعث بہت سارے مسلمانوں اور تقریباً سب ہی غیر مسلموں کی اسلامی قانون کے بارے میں خراب رائے ہے اور اس بارے میں ان کے ذہنوں میں کئی شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔مسلمانوں کو اپنی ریاست کا بہتر نمونہ پیش کرنا چاہیے اور اسلام کی اقدار اور اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔

۵۔ آفاقی اخلاقی تعلیمات (معروف):

تم وہ بہترین امت ہو،جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم دیتے

ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں ایمان والے بھی ہیں، لیکن اکثر تو گناہ گار ہیں۔
(آل عمران: ۱۱۰)

معروف کو اختیار کرنے اور منکر سے رکنے کی قرآنی دعوت آفاقی اخلاقی اقدار سے متعلق ہے۔ معروف اور منکر کی ان دونوں اصطلاحات کے معنیٰ بہت وسیع ہیں اور ان کا صحیح فہم مسلمان کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

۶۔ انسانیت اور عالمی اخوت:

سارے انسان ایک خاندان کے ارکان کی مانند ہیں۔ البتہ ایک دوسری سطح پر ان کا تعلق مختلف قومیتوں اور مختلف ممالک سے ہے۔ ایک بالکل ہی دوسری سطح پر تمام مسلمان امت مسلمہ کا حصّہ ہیں، جب کہ ایک اور سطح پر وہ انسان بھی ہیں۔ ان مختلف وابستگیوں کے درمیان اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ کسی بھی شخص کا اپنے خاندان یا قومیت کے انتخاب میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ ایک فرد کسی بھی خاندان میں پیدا ہوسکتا ہے اور اس کے اپنے خونی اور خاندانی رشتے ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں قومیت کا معاملہ خاصا لچک دار ہوگیا ہے، اس کی وجہ عالمی سطح پر بہت زیادہ نقل مکانی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے وطن اور دنیا کے کسی اور خطّے سے یکساں وفادار رہے۔ مسلمانوں کو اس حقیقت کو اپنے مہاجر ممالک میں واضح کرنا چاہیے۔ ان کو اعلیٰ مقاصد کی حمایت میں آگے ہونا چاہیے۔ ان کو عالم گیریت کی تحریک میں پیش پیش رہنا چاہیے۔ (۱۰)

۷۔ شورائیت:

شوریٰ (مشورے کا نظام) ایک انتہائی اہم عمل اور بنیادی ادارہ ہے۔ اقدار کے اسلامی تناظر میں بھی اس کی بہت اہمیت ہے۔ اسلام شوریٰ کی مختلف سطحوں پر ہمت افزائی کرتا ہے، اسلام زور زبردستی کا قائل نہیں۔ غرض یہ کہ ریاست کے انتظام اور قیادت میں سب کی شراکت داری ہونی چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر نظام سے جو افراد متاثر ہوتے ہیں، ان کو نظام میں شراکت دار ہونا چاہیے۔

۸۔ قانون کی بالادستی:

اسلام میں قانون کی بالادستی کا تصور اجمالی طور پر ان چار نکات میں پیش ہے:

۱۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں۔ قانون معروضی اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے اور ہر ایک کی اس تک رسائی ہونی چاہیے۔

۲۔ عدلیہ آزاد ہو۔

۳۔ قانون پر عمل غیر جانب دارانہ ہو۔

۴۔ قانونی نظام یا سیاسی نظام جھگڑے سلجھاتا ہے اور ریاست اور شہریوں کو تشدد کا کوئی موقع نہیں دیتا۔

۹۔ باہمی خیر کے لیے اشتراک:

یہ فطرت انسانی کی خصوصیت ہے کہ وہ مشترک نکات کے بہ جائے اختلافات کو زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ اسلام انسانوں کو حق کی دعوت دیتا ہے اور جہاں بھی ممکن ہو ساتھ ساتھ کام کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

۱۰۔ بہ طور اصول تشدد پر پابندی:

امن اور عدم جارحیت اسلام کے اصول ہیں۔ اسلام ناجائز جارحیت کی صورت میں تشدد کے استعمال کو مسترد تو کرتا ہی ہے، لیکن جائز صورتوں میں طاقت کے استعمال میں بھی تشدد کو پسند نہیں کرتا۔ تاہم صرف اپنے دفاع میں تشدد کی گنجائش ہے، بل کہ اس صورت میں بھی تشدد سے بچنا چاہیے اور قانون کے مطابق ہی کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تشدد کرنا ہرگز جائز نہیں، بالخصوص خدائی فوج دار کی شکل میں۔

۱۱۔ دوسروں کے انجام پر فیصلے سے بچنا:

آخرت میں اللہ تمام امور کا فیصلہ کرے گا، اس لیے یہ لازم ہے کہ عقیدے سے متعلق معاملات اللہ کے سپرد کر دیے جائیں اور مسلمان دوسرے لوگوں کے بارے میں اپنا فیصلہ نہ دیں۔

۱۲۔ظاہری صورت کے بہ جائے اصل پر توجہ:

عقیدہ محض ایک زبانی اظہار بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ بن کر رہ گیا ہے، جس کے پیچھے وہ جذبہ اور شدت نہیں، جو اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ایمان کی خاصیت تھی اور اسی کی وجہ سے مسلمانوں نے تہذیبی اور معاشرتی شعبوں میں بڑے کارنامے انجام دیے۔ بلاشبہ ایک احساس کے طور پر اسلام آج بھی زندہ ہے۔ یہ کروڑوں لوگوں کے دل کی دھڑکن ہے، جو اس کے اصولوں کو برحق سمجھتے ہیں۔لیکن ان میں سے زیادہ تر افراد ان اصولوں کا فہم نہیں رکھتے اور ان اصولوں پر اپنی عملی زندگی میں کام نہیں کرتے۔ (۱۱)

آج مسلمان ایک بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں۔ان کے رسوم ورواج روح اور مغز سے خالی ہو چکے ہیں۔قرآن کا فہم یا اس کے مطالعے کے بہ جائے اس کے حفظ کرنے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

۱۳۔زندگی کے تجربات کو اجتماعی اکتساب کا حصہ تسلیم کرنا:

روایتی فہم اور طرز کے برخلاف اسلام صرف کتاب کے مطالعے پر مبنی عقیدہ نہیں ہے۔اللہ ان سے اس کائنات کو سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے، تاکہ وہ زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔اللہ نے انسان کو سفر کرنے، مشاہدہ کرنے اور تاریخ سے سبق لینے کا حکم دیا ہے۔مقدس کتابوں کے مطالعے میں مشغول رہنے کے بہ جائے ان کو حقیقت کا مشاہدہ اور اس پر غور کرنا چاہیے۔

اقدار کی مذکورہ بالا فہرست مکمل نہیں ہے۔البتہ یہ مذکور اقدار اور اصول قرآن سے اخذ کی گئی ہیں اور اس تصنیف میں انھی کا بیان ہے۔غیر قرآنی مآخذ سے مستعار اسلامی قوانین پر عمل میں انھی اقدار اور اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔اگر قرآن اور حدیث کے علاوہ دیگر مآخذ ان اقدار اور اصولوں سے ٹکراتے ہوں تو اقدار ہی کو ترجیح دینا چاہیے۔رسول اکرمؐ اللہ کے آخری پیغام کے حامل ہیں، لہٰذا آپ کی سیرت قرآن کی تردید نہیں کرسکتی۔قوانین اور ضوابط کے بارے میں طرز فکر جزوی یا تقلید محض کا نہیں ہونا چاہیے۔کوئی قانون، جسے انسان نے بنایا ہو کسی صورت میں قرآنی اصولوں کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔اگر اس کے بارے میں پختہ ثبوت موجود ہو تو معاملہ مختلف ہے۔

باب سوم

اسلامی قانون میں حدیث کا مناسب اور بے جا استعمال

قرآن اسلام کا بنیادی مآخذ ہے۔ سنت نبوی اس کا دوسرا مآخذ ہے۔ سنت نبوی سے مراد رسول اکرمؐ کی حیات مبارک، آپ کا مثالی طرز عمل، افعال اور اقوال ہیں اور یہ سب ایمان کا حصہ ہیں۔ احادیث کے حوالے سے بعض اہم باتوں پر اس باب میں گفتگو کی جائے گی اور اسلامی قانون کی تشکیل میں حدیث کے بے جا استعمال پر خصوصیت سے روشنی ڈالی جائے گی۔

سہولت کی خاطر اس گفتگو میں حدیث اور سنت کو ایک ہی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ سنت سے مراد وہ طرز حیات اور مثالی رویہ ہے، جس کو بہ طور معیار اختیار کرنا چاہیے۔[۱۲] البتہ احادیث اور سنت کے باب میں بعض عمومی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔

ان میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ جب کسی حدیث میں رسول اکرمؐ کا کوئی قول بیان ہوتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ نے بالکل یہی الفاظ استعمال کیے تھے۔ قارئین کو یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ قول آپ کے الفاظ کے مفہوم ہیں۔ ہر مجموعۂ حدیث میں یہ بات نہیں ملتی ہے۔ روایت میں اختلاف کا مطلب یہی ہے کہ آپؐ کے الفاظ ہو بہو نقل نہیں ہوئے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حدیث کے ہر مجموعے میں صحیح روایات موجود ہوتی ہیں۔ یہاں حدیث کے غیر مستند مجموعوں کا ذکر نہیں ہے۔

صحاح ستہ کے نام سے حدیث کے چھ مستند مجموعے ہیں۔ البتہ ماہر ترین علمائے حدیث کے مطابق بخاری مجموعے میں بھی شامل تمام روایات بالکل کھری نہیں، بل کہ بعض اختلافی بھی ہیں۔ صحیح احادیث کی بھی الگ الگ تعبیر اور تشریح ممکن ہے۔ اس تعبیر اور تشریح میں غلطی کا

بھی امکان ہے۔ یہ تصور عام اور گہرا ہے کہ حدیث کی روایات میں آپسی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ لیکن ایسی بہت سی احادیث ہیں، جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ مثال کے طور پر ربا (سود) کے موضوع پر مخالف احادیث ملتی ہیں۔

یہ خیال بھی عام ہے کہ حدیث کی کتب سے جو معلومات یا علم حاصل ہوتا ہے، وہ یقینی اور مستند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف متواتر باللفظ احادیث اس لحاظ سے معتبر ہیں کہ یکساں الفاظ میں متعدد راویوں کی سند پر ایک ہی روایت بیان ہوئی ہے۔ متواتر بالمعنیٰ احادیث بھی اس اعتبار سے معتبر نہیں ہیں۔ متواتر باللفظ روایات کی تعداد بیس سے زائد نہیں ہیں، اس حقیقت کو محدثین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ تقریباً تمام سرمایۂ حدیث آحاد روایات پر مشتمل ہے۔ ان سے حاصل علم کا مستند ہونا ممکن ہے، لیکن اسے یقینی علم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ان احادیث کے تشکیل قانون، ضوابط اور عقائد میں استعمال کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ البتہ علما کی اکثریت اس کی قائل ہے کہ احاد احادیث کو بھی سب پر فرض قوانین اور ضوابط بنانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کے باوجود اسلامی قانون کی تشکیل میں حدیث کے مناسب اور بے جا استعمال کے موضوع پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ تقلید محض کے رجحان کے بہت سے نتائج سامنے آتے ہیں۔ مسالک کا ظہور بعض اعتبار سے مفید ہے، لیکن اس سے مسلم معاشرہ خیموں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ اس رجحان کا دوسرا اہم اثر یہ ہے کہ اسلام کے نام پر بنائے گئے بہت سے قوانین میں صنفی امتیاز داخل ہوگیا ہے اور انصاف اور برابری کے اسلامی اصول کے خلاف رویے ملتے ہیں۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں پیش ہے۔

رسول اکرمؐ نے مسجد پر مرکوز مسلمانوں کی زندگی میں خواتین کی باقاعدہ اور بلا رکاوٹ شرکت کا حکم دیا، لیکن زیادہ تر مسلم اکثریتی ممالک، حتیٰ کہ مغربی ممالک میں بھی باجماعت نماز میں خواتین کی شرکت نظر نہیں آتی۔ مسجدوں میں ان کے داخلے پر پابندیاں ہیں اور ان کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔ اگر کسی وجہ سے مردوں کو ان خواتین کو برداشت ہی کرنا پڑتا ہے تو یہ تجربہ خواتین کے لیے خاصا تلخ اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں دو احادیث کا مطالعہ پیش ہے:

''عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: عورت کے لیے یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے صحن کے بہ جائے اپنے مکان کے اندر نماز پڑھے اور یہ اس کے لیے مزید بہتر ہے کہ اپنے مکان کے اندر کے بہ جائے وہ اپنی ذاتی کوٹھری میں نماز پڑھے۔''(۱۳)

''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: اگر رسول اللہ کو ان خواتین کے افعال کا علم ہوتا، آپؐ ان کو مسجد جانے سے منع کر دیتے، جیسے بنی اسرائیل کی خواتین کو منع کیا گیا تھا۔ یحییٰ ابن سعید (راوی) نے عمرہ (ایک اور راوی) سے دریافت کیا کہ کیا بنی اسرائیل کی خواتین کو منع کر دیا گیا تھا تو انھوں نے اس کا جواب ہاں میں دیا۔''(۱۴)

عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی حدیث صحیح ہے، گو متواتر نہیں ہے۔ اس سے یہ یقینی علم نہیں حاصل ہوتا، جس کی بنیاد پر رسول اکرمؐ کا قول ثابت ہو۔ اس حدیث کی مخالف بھی بہت سی احادیث ہیں، جس میں خواتین کے مسجد آنے جانے کا ذکر ہے، وہ باقاعدگی سے اور بڑی تعداد میں مسجد جاتی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو یہ خواتین رسول اکرمؐ کی زندگی ہی میں آپؐ کی ہدایت پر عمل نہیں کرتی تھیں یا اس حدیث کے کوئی دوسرے معنیٰ ان کے ذہن میں تھے۔

جہاں تک دوسری روایت کا تعلق ہے، یہ صحیح بخاری میں یقیناً شامل ہے، لیکن یہ قول رسول اکرمؐ کا نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ایک صحابیہ کی رائے ہے، جو بلاشبہ ایک ممتاز صحابیہ تھیں اور جن کو بہ طور زوجۂ رسول آپؐ سے انتہائی قرب کا شرف حاصل تھا۔ علم حدیث کی اصطلاح میں ایسی روایت کو اثر کہا جاتا ہے۔ اس روایت کے راوی یقیناً ایک قابل احترام، معظم راوی حدیث صحابیہ ہیں، جو کہ زوجۂ رسول بھی ہیں، لیکن اس روایت میں ان کی محض اپنی رائے درج ہے۔ یہ رسول اکرمؐ کا قول نہیں ہے۔ اس دور کی کوئی اور روایت یا بیان مذکورہ بالا روایت کی حمایت نہیں کرتی کہ اس دور میں خواتین مسجد میں نازیبا حرکتیں کرتی تھیں۔ البتہ اس روایت کا مسلم معاشرے پر زبردست اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں عوامی مقامات پر عورتوں کی شرکت محدود ہو گئی۔

اسی رجحان کے اثر کی ایک اور مثال یہ ہے کہ خواتین کو قیادت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ابوبکرہ (یہ راوی ابوبکرہ ہیں، نہ کہ خلیفہ راشد ابوبکر) سے صرف ایک روایت مروی ہے۔ مندرجہ ذیل روایت کی بنیاد پر قدامت پرست علما کا یہ یقین ہے کہ خواتین انتظامی قیادت کی اہل نہیں ہیں:

> ابوبکرہ روایت کرتے ہیں کہ جنگ جمل کے دوران اللہ نے مجھے ایک کلمے سے نوازا، جو مجھے رسول اللہ نے عطا کیا تھا۔ جب رسول اللہ کو علم ہوا کہ اہل فارس نے خسرو کی بیٹی کو اپنا حکم راں بنالیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جو قوم کسی عورت کو اپنا سربراہ بناتی ہے، وہ کبھی کامیابی نہیں پاسکتی۔''(۱۵)

ابوبکرہ وہ شخص ہیں، جن کو جھوٹی گواہی کے جرم میں سزا ملی تھی۔(۱۶)

یہ روایت بخاری کے اپنے معیار پر پوری نہیں اترتی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کو اپنے مجموعے میں شامل کرلیا۔ قرآن نے ملکہ سبا بلقیس کا حال بیان کیا ہے، لیکن اس میں خاتون کی قیادت کے بارے میں کوئی منفی تبصرہ نہیں ملتا۔ البتہ محض ایک واحد روایت کی بنیاد پر جس کا راوی مشکوک ہے، خواتین کی قیادت پر پابندی لگادی گئی۔

حدیث کے بے جا استعمال کی ایک اور نمایاں مثال ارتداد کی سزا سے متعلق ہے۔(۱۷) ارتداد کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ محض قابل سزا جرم ہی نہیں، بل کہ اس کی سزا موت ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے افراد اپنا مذہب چھوڑ کر آزاد رہتے ہیں اور ان کو کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ ارتداد کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے: ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اس کو قتل کردو۔''(۱۸) یہ بھی آحاد روایت ہے۔ کوئی حدیث رسول اکرمؐ کے اس عمل کی تصدیق نہیں کرتی کہ آپؐ نے صرف ارتداد کے کسی مجرم کو سزا دی ہو، بل کہ آپؐ کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ اگر اس جرم کی سزا موت ہوتی اور یہ اتنا سنگین معاملہ ہوتا تو قرآن میں اس کا ضرور ذکر ہوتا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی ہے، بل کہ قرآن دین کے معاملے میں آزادیِ انتخاب کا اعلان کرتا ہے۔ حالاں کہ سزائے موت

کے بارے میں اب رائے تبدیل ہو رہی ہے۔ بہت سے علما نے ایک احاد روایت کی خاطر قرآن کے بلند اصول عالیہ کو نظر انداز کر دیا۔

محدثین نے یقیناً ذخیرۂ حدیث کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حدیث سے بالعموم صرف ظنی علم حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کے دور میں سرمایۂ حدیث کو معلومات کے اہم ذخیرے کے طور پر استعمال کرنا چاہیے، اس سے حکمت اور اخلاقی سبق لینا چاہیے۔ البتہ قانون اور ضوابط بنانے میں اس کا استعمال احتیاط سے کرنا چاہیے، کیوں کہ ان قوانین اور ضوابط کا براہ راست اثر زندگی، عزت نفس، مال اور جائداد پر پڑتا ہے۔ ایسے قوانین اور ضوابط کے بارے میں مزید محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جس کے نتیجے میں کوئی تعصب یا ناانصافی کا اندیشہ ہو۔

باب چہارم

نظریۂ اجماع: کیا اتفاق رائے پایا جاتا ہے؟

قانون اسلامی کے چار مآخذ میں ایک ماخذ اجماع بھی ہے۔ اسلام کے بنیادی مآخذ دو ہیں: قرآن اور سنت، جب کہ بقیہ دو مآخذ اجماع اور قیاس ثانوی ہیں۔ اسلام میں اجماع کا اہم مقام ہے، خواہ زیر بحث مسئلے کا تعلق عقیدے سے ہو یا آداب یا قوانین یا ضوابط سے۔ یہ معاشرتی اور دینی اتحاد اور اتفاق میں مفید ہوتا ہے۔ اس بارے میں مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اجماع سے متعلق زیادہ تر دعوے بے بنیاد اور غیر مستقل ہیں۔ اجماع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔

ہر چند کہ اسلام میں اجماع کی اہمیت مسلمہ ہے، لیکن مسلمانوں کی اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ بہ طور مآخذ اجماع کی حیثیت بڑی کم زور ہے۔ اسلام سے متعلق مباحث میں اجماع نے ایک حد تک اتحاد اور اتفاق کی راہ ہم وار کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے اختلافات کی خلیج کو بھی بڑھا دیا ہے۔ اس سے بھی اہم تر نکتہ یہ ہے کہ اکثر اجماع کا بے جا استعمال ایسے آلے کے طور پر کیا جاتا ہے، جس سے مخالفین کو خاموش کر دیا جائے یا اجماع کے نام پر کسی نامناسب بات کو جائز ثابت کیا جائے، بالخصوص ایسے افعال اور نکات کے متعلق جن کے بارے میں کوئی اجماع نہیں پایا جاتا۔ یہ مسئلہ نازک اور اہم ہے۔ کیوں کہ یہ تصور عام ہے کہ اگر کسی عقیدے یا قانونی معاملے کے بارے میں اجماع ہے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس پر عمل کریں۔

ذیل میں ان امور کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن کے متعلق علما اور فقہا کا دعویٰ ہے کہ ان کے بارے میں اجماع ہے: ایک نشست میں تین طلاق جائز ہیں۔ تراویح کی ۲۰ رکعات ہیں۔

خواتین کی قیادت منع ہے۔ تلفیق ناجائز ہے (تلفیق کا مطلب مختلف مسالک کے فتاوی کو گڈمڈ کرنا ہے) اور دیگر امور۔

اولاً اصطلاح اجماع کی تعریف ہی دشوار ہے۔ درحقیت اس نکتے پر اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ امام شافعی (۸۲۰م) کے دور تک اجماع کی تعریف کبھی موضوع گفتگو ہی نہیں رہی۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں علما اور فضلا نے اجماع کی تعریف پیش کی۔ متعدد فضلا کا ان معیارات کے بارے میں اختلاف ہے، جو اجماع کی تعریف میں استعمال ہوتے ہیں۔ خود صحابہ کا بہت سے مسائل پر ایسا اتفاق رائے نہیں تھا، جس کو ہم اجماع کہہ سکیں۔

ثانیاً اجماع کا مآخذ کون سی قوت ہے؟ اس نکتے پر بھی علما متفق نہیں ہیں۔ بعض علما نے ایسے قرآنی اقتباسات کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے، جو کہ اجماع کو بہ طور مآخذ ثابت کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بعض علما نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ اجماع کی حمایت میں عام طور پر اس حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے: ''میری امت کسی غلطی پر اتفاق رائے نہیں کرے گی۔''[19] لیکن حدیث کے دیگر مجموعوں میں یہ روایت مختلف الفاظ میں درج ہے۔ اجماع کی حمایت میں مذکورہ احادیث میں ایک کمی یہ ہے کہ یہ متواتر نہیں ہیں، لہٰذا ان سے متن کے معنیٰ اور مفہوم کے بارے میں یقینی علم حاصل نہیں ہوتا۔ بعض روایات کے سوا دیگر روایات متواتر نہیں ہیں، جیسا کہ بیان ہوا اور ان روایات میں اکثریت آحاد کی ہے۔ حتیٰ کہ صحیح روایات بھی مضبوط نہیں ہیں۔

فقہی مذاہب کے سامنے آنے میں اجماع نے نمایاں کردار انجام دیا کہ اجماع کی روشنی میں قوانین، ضوابط اور عقائد کو مرتب اور منظّم کیا گیا۔ اس کے بعض پہلوؤں میں رنگا رنگی اور اختلاف رائے کی گنجائش ملتی ہے۔ البتہ کوشش یہ رہی کہ ہر مسلک میں عبادات اور رسوم و رواج کے بارے میں رائے قائم ہو جائے۔ لیکن پندرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی بعض باتوں کے متعلق مذاہب میں کوئی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا، مثلاً تراویح کی رکعات بیس ہیں یا آٹھ، باجماعت نماز میں آمین بالجہر کہی جائے یا نہیں وغیرہ۔

درحقیقت ان قوانین اور ضوابط کے منظّم ہونے کے نتیجے میں بین المسالک اختلافات میں مزید شدت آ گئی ہے اور دوسروں کو برداشت نہ کرنے کا رویہ ملتا ہے۔ حنفیوں کے ہاں حنفی مرد اور شافعی عورت کے مابین نکاح جائز ہے، لیکن شافعی مسلک کے مطابق یہ ناجائز ہے۔ (۲۰) قوانین اور ضوابط میں فرق محض عصر حاضر ہی میں نہیں پایا جاتا، بل کہ ان اقدار اور اصولوں کے بارے میں بھی اختلاف ملتا ہے، جن پر ان کا دارومدار ہے۔ اجماع سے متعلق توجہ اور تنقید کا ایک پہلو یہ ہے کہ اجماع کا عمل مخصوص افراد تک محدود نہیں رہنا چاہیے، جن افراد کی زندگی اس اجماع سے متاثر ہو، ان سے صلاح مشورہ لازم ہے۔ بلاشبہ اس عمل میں پوری امت کی براہ راست منظوری حاصل کرنا عملاً ممکن نہیں، البتہ اس صورت میں شوریٰ کے اصول پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنا چاہیے۔ اجماع اور شوریٰ دونوں کو مجتمع کر کے فیصلہ سازی کا ایسا طریقہ بنانا چاہیے، جس میں سب کی نمائندگی ہو، تاکہ پوری امت میں حرکت اور عملی جذبہ بے دار ہو۔ کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لیے یہ شرائط ہیں: ۱) اس قانون کی تشکیل اسلام کے بنیادی مآخذ میں پیوست ہو۔ ۲) اس کے بنانے میں اسلام کے مقاصد اور اقدار کو مرکزی مقام حاصل ہو۔ ۳) شوریٰ کے ذریعے اس قانون کا معاشرے میں نفاذ ہو۔

تاریخ اسلام میں اجماع کا اہم کردار رہا ہے اور فقہ کے بعض پہلوؤں سے اس کا خصوصی تعلق ہے۔ البتہ اس بارے میں پیش کی جانے والی اصل دلیل یہ ہے کہ کسی تصور کو مسلمانوں کے سامنے بہ طور حکم الٰہی نہیں پیش کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں اللہ کا حکم پایا ہی نہیں جاتا، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اجماع محض چند معاملات کے بارے میں ہے اور وہ بھی بنیادی، وسیع تر امور کے بارے میں۔ لہٰذا اجماع سے متعلق دعویٰ قبول کرنے کے باب میں مسلمانوں کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ درحقیقت متقی مسلمانوں کو صرف اسلام پر عمل کرنا چاہیے۔ حرکی، حیات بخش اور مسائل کے حل پر مرکوز طریقے پر عمل کرنا چاہیے۔ اقدار سے وابستہ رہنا چاہیے اور بے لچک عقیدے کی اندھی تقلید اور ضابطہ پرستی سے دور رہنا چاہیے۔

باب پنجم

قیاس اور اسلامی قانون کے بعض مشکل مسائل

محدثین نے حدیث کے مجموعے مرتب کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور احادیث کی استناد کا طریقہ وضع کیا ہے۔ ہر حدیث نہ اللہ کی طرف سے ہے اور نہ ہی خطا سے خالی۔ اسلامی قانون کے دیگر دو مآخذ اجماع اور قیاس میں وحیِ الٰہی نہیں ہے۔ اسلامی فقہ کا چوتھا ماخذ قیاس ہے اور یہ ایک کارآمد اور جائز وسیلہ ہے۔ قیاس پر کی گئی درج ذیل گفتگو میں بعض پریشان کن تصورات کا تذکرہ ہے اور مثالوں سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس وسیلے کا اسلامی قانون سازی میں کیسے غلط استعمال کیا گیا ہے؟

جب بھی فقہا کا سامنا نئے مسائل سے ہوتا ہے، وہ ان کا حل تلاش کرنے کے لیے قیاس سے مدد لیتے ہیں۔ قرآن، سنت اور حدیث مسلمانوں کو روزانہ پیش آنے والے تمام مسائل اور ہر صورت حال کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس صورت میں قیاس کا سہارا لیا جاتا ہے۔ قیاس کے لغوی معنیٰ اندازہ لگانا، مساوی حالت متعین کرنا وغیرہ ہیں۔ [۲۱] قیاس سے مراد نئی صورت حال اور ماقبل کے عمل کے بیچ مطابقت تلاش کرنا، بالخصوص سنت نبوی سے رہ نمائی حاصل کرنا ہے۔ [۲۲] قیاس کے فائدے اور نقصان دونوں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا کہ اجماع کے سلسلے میں غلط طریقۂ کار کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قیاس کے بارے میں صحابہ کے اتفاق رائے کا دعویٰ ثابت نہیں ہے۔ بہت سے صحابہ نے نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایسے طریقے کو اپنایا، جس کو قیاس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ صحابہ کا یہ عمل متعین طور پر قیاس کا عمل تھا اور پھر اس پر اجماع منعقد ہوا۔ علما کسی ایسی قرآنی آیت کی موجودگی میں متفق نہیں، جو کہ قیاس کا جواز ثابت کرتی ہے۔ بعض علما حدیث کے مجموعوں میں مذکور سنت نبوی کی روشنی میں قیاس کو جائز بتاتے ہیں، البتہ اس بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے۔

اجماع اور قیاس کے بیچ بہت قریبی تعلق ہے۔ قیاس کو تسلیم کرنے کے لیے لازم ہے کہ اس نکتے پر اجماع ہو۔ عقلی سطح پر اس مقام پر دشواری پیش آئی ہے۔ ہر چند کہ چاروں سنی فقہی مذاہب قیاس کو اسلامی فقہ کا مآخذ مانتے ہیں، لیکن خود قیاس کیا ہے؟ اور اس کے دائرۂ کار اور اس کی توثیق کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ قیاس سے متعلق اتفاق رائے بہت کم ہے۔ ہر مسلک نے اپنے اپنے طور پر قیاس کی تعریف کی ہے اور اس کے خصوصی معنیٰ اور مطلب متعین کیے ہیں۔ مثال کے طور پر امام شافعی کی رائے میں قیاس اور اجتہاد ایک ہیں، جب کہ دیگر فضلا اس کو نہیں مانتے۔ چاروں مسالک میں مشترک معاملہ علت کی شناخت ہے۔ اس بارے میں بھی اتفاق رائے موجود نہیں ہے کہ قیاس اسلامی فقہ کا ایک معتبر طریقۂ کار ہے۔ اسی طرح علت کی تعریف کے ضمن میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے جائز ہونے کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ (۲۳)

قیاس سے متعلق ایک اور مسئلہ اس کے ماخذ، طریقے اور استناد میں ہے۔ اصل اور قیاس پر مبنی فتوے کے بیچ مطابقت پر اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ قیاس زیادہ سے زیادہ ایک اندازے پر مبنی ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا فیصلہ انسانی عقل کرتی ہے۔ لہٰذا غلطی سے خالی الٰہی مآخذ اور غلطی کے امکان کے دنیوی مآخذ کو جمع کرنے کی صورت میں انسان کے غلطی پر ہونے کو عاجزی کے ساتھ تسلیم کرنا لازم ہے، ورنہ زیادتی اور ناانصافی ہونے کا خطرہ ہے۔

قیاس کے استعمال سے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں، مثال کے طور میں نکاح میں کفو کا معاملہ۔ یہ معروف ہے کہ نکاح کے خواہش مند فریقین میں زیادہ سے زیادہ اقدار یکساں ہونا چاہیے اور ان کا پس منظر یکساں ہونا چاہیے۔ البتہ اس نکتے کو قانونی شکل عطا کر دینا اور اس کے خلاف کرنے کی صورت میں قاضی اور گھر والوں کی مداخلت کو قانونی حیثیت دینا تقلید محض کی شکل ہے، حنفی فقہ کی ایک تصنیف ''الھدایہ'' میں مرغینانی (۱۱۹۷م) (۲۴) لکھتے ہیں: ''شادی کی توثیق اور اس کے جائز ہونے کے بارے میں یہ نکتہ ہے کہ اگر کوئی عورت ایسے مرد سے شادی کرے، جو حیثیت میں اس سے کم ہے تو اس کے سرپرستوں کو اختیار ہے

کہ وہ دونوں میں علاحدگی کرادیں اور اس رشتے سے ان کی جو بے عزتی ہوئی ہے، اسے دور کردیں۔''(۲۵)

مذکورہ بالا اقتباس کا پریشان کن ٹکڑا شادی کے بارے میں اس کی یہ شرط ہے، جس کا قرآن اور سنت سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اضافہ نامناسب ہے کہ سرپرست عدالتی نظام کی مدد سے علاحدگی کرا سکتے ہیں۔ کفو کے جواز میں یہ متن بہ طور ثبوت پیش کیا جاتا ہے: ''اپنے نطفے کے لیے بہترین خواتین کا انتخاب کرو، کفو کے لحاظ سے شادی کرو اور ان کو نکاح کا پیغام دو۔''(۲۶)

یہ روایت متواتر باللفظ یا متواتر بالمعنیٰ نہیں ہے۔ اگر یہ روایت اصطلاحاً صحیح بھی ہوتی تو بھی اس سے یقینی علم نہیں حاصل ہوتا۔ اس کا ایک اور زیادہ دشوار کن پہلو یہ ہے کہ مذکورہ حدیث صحیح بھی نہیں ہے۔ سرمایۂ حدیث کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کوئی اور حدیث موجود نہیں ہے۔ غرض یہ کہ قانون اندازے پر مبنی ہے اور اس کے خلاف کرنے پر قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ اس معاملے میں فضلا نے برابری کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ یہ قیاس کے حکم میں داخل ہوگیا، جب کہ اس طرح کی دلیل قرآن اور سنت سے ثابت نہیں ہے۔

اس معاملے میں اسلام کا انصاف اور برابری کا اصول بالکل ختم ہوگیا ہے۔ ''الھدایہ'' کے اقتباس پر مزید غور کریں۔ اگر عورت بالغ ہے اور برابری کے بغیر بھی شادی کا تعلق برقرار رکھنا چاہتی ہے، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر لحاظ سے برابری کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ اس کتاب کا ایک قابل اعتراض پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں نائی جولا ہے اور دباغت کا کاروبار کرنے والے پیشہ ور افراد کو حقیر اور ذلیل بتایا گیا ہے۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ رسول اکرمؐ نے کبھی کسی پیشے کو برا بھلا کہا ہو، بل کہ آپؐ نے ہر ایمان دار محنت کش کی تعریف کی ہے۔ خطبۂ حجتہ الوداع میں آپؐ نے ہر بے انصافی کو دور کرتے ہوئے فرمایا:

> تمام انسان آدمؑ اور حواؑ سے ہیں۔ کسی عرب کو غیر عرب یا کسی غیر عرب کو عرب پر بڑائی حاصل نہیں۔ اسی طرح کوئی سفید فام کسی سیاہ فام یا کوئی سیاہ فام کسی سفید فام سے برتر نہیں۔ برتری صرف تقوے اور نیک اعمال کی بنیاد پر ہے۔

ستم ظریفی یہ کہ ''الھدایہ'' کے مذکورہ بالا اقتباس کا عنوان یہ ہے: ''کفو کے لغوی معنیٰ برابری کے ہیں۔''[۲۷] البتہ اس قانون اور عقلی تجزیے میں برابری کے بہ جائے ناانصافی پر عمل ہوا۔ نیت خواتین کے مقام اور حقوق اور خاندان کی حفاظت کی تھی، لیکن عملاً اس کے ذریعے عورت کا درجہ کم تر کر دیا گیا۔ قیاس کے بے جا استعمال کے ذریعے مساوات کے اصول میں خواتین کی کم تر حیثیت کر دی گئی۔

اس باب میں دیگر مثالیں بھی قیاس کے بے جا استعمال کی گواہ ہیں۔

باب ششم

اسلامی فقہ اور نظر انداز کردہ تجرباتی بنیاد

بیس مسلم معاشروں اور ممالک پر طاری فکری جمود اور ناانصافی کے اسباب سے متعلق ہمیں سنجیدہ سوال اٹھانے چاہیے۔ گراوٹ رفتہ رفتہ غالب آ گئی ہے اور مسلم معاشرے فی الواقع بے عملی کا شکار ہیں اور اپنے داخلی وخارجی عوامل کے سبب امت مسلمہ اپنے زیادہ تر مسائل کے حل سے دور ہے اور ترقی یافتہ قوموں سے مقابلے کی اہلیت سے محروم ہو چکی ہے۔ مثلاً مسائل کے حل کے بارے میں زمینی حقائق اور اسلامی قانون میں اتنی بڑی خلیج کیوں ہے؟ انصاف اور توازن کے اسلامی اصولوں پر عمل میں کیا رکاوٹ ہے؟ کلاسیکی اسلامی قانون کی بعض شقوں کے خلاف آج مسلمان خواتین کیوں بغاوت کا علم بلند کیے ہوئے ہیں؟ وہ سیکولر قوانین کی جانب کیوں مائل ہیں؟ مسلمان پس ماندگی سے کیوں دوچار ہیں؟

یہ نکتہ اہم ہے کہ ان امور کی تفہیم میں اس حقیقت کو ماننا ضروری ہے کہ اسلامی فقہ میں تجرباتی بنیاد کی کمی ہے۔ تجرباتی بنیاد کی اصطلاح یہاں محدود معنیٰ یعنی صرف مشاہدے اور تجربے کے حوالے سے استعمال نہیں کی گئی ہے، بل کہ اسلامی فقہ کا ایک اہم پہلو زیر غور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں آج کے مفہوم میں تجرباتی بنیاد کی کمی ہے۔

اسلام اور اس کے قوانین میں حرکی صفت کے غائب ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری توجہ صرف بنیادی متون اور مآخذ پر مرکوز رہتی ہے۔ اسی باعث وہ غیر مسلم حضرات، جو اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ اس مذہب کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسلام کی خراب تصویر پیش کرتے ہیں۔ روایتی اسلام بڑی حد تک تقلیدی ہے اور اس کا انحصار بنیادی، ثانوی اور بالواسطہ کتب پر ہے، جو کہ زمینی حقائق سے بالکل غیر متعلق، بل کہ بے نیاز ہیں۔

قانون بنانے سے پہلے تحقیق اور تجرباتی طریقۂ کار سے کسی بھی بات کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ صفت اسلامی قانون میں موجود نہیں ہے۔ قانون بنانے سے جو اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں، اس بارے میں بھی کوئی تحقیق یا تجربے نہیں کیے جاتے ہیں۔

بہ طور مثال وراثت کا معاملہ پیش ہے۔ شریعت کے مطابق اراکین خاندان کے ترکے میں حصّے طے ہیں اور اس میں صرف بنیادی کتب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ البتہ ترکے کی اس تقسیم سے خواتین جس طرح متاثر ہوتی ہیں، جدید دور میں اس کا کوئی مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ صراحت غالباً غیر ضروری ہے کہ خواتین معاشرے کا کم زور طبقہ ہیں۔ مردوں کے لیے یہ نہایت آسان ہے کہ وہ اپنی خاندانی ذمے داریوں کو نظر انداز کر دیں، جب کہ خواتین کے لیے عملاً ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ عورت کو کسی نہ کسی کا تحفظ بہر کیف حاصل رہتا ہے، مثلاً اپنے والد، شوہر، بھائی، بیٹے یا ریاست اور معاشرے کا۔ لیکن خواتین کی بری حالت کا کوئی مطالعہ نہیں کرتا، اس بارے میں مناسب، متعین معاشرتی تجزیوں کی کمی ہے اور اس کا کوئی علم نہیں کہ سخت گیر قانون وراثت سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کی نوعیت اور سطح کیا ہے؟

زمینی حقائق سے دور قانون بنانے کا ایسا طریقہ، جس میں قرآن اور سنت کے اصول نظر انداز کیے جاتے ہیں، اس سے لوگوں کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ قانون بنانے والے حضرات کا فرض ہے کہ وہ عملی زندگی کا مطالعہ کریں کہ ان قوانین کا عام آدمی کی روزمرہ کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اور قانون کے مقاصد عالیہ اور زمینی حقائق میں اتنی بڑی خلیج کیوں ہے؟ اس مطالعے کی روشنی ہی میں وہ اس امتیاز اور خلیج کو دور کر پائیں گے۔

ایک مزید مثال اسلامی معاشیات اور مالیات کا میدان ہے، چوں کہ مذہبی اور دنیوی تعلیم میں دوری پائی جاتی ہے۔ صرف چند مسلم علما اور فقہا ہی جدید معاشیات اور مالیات کے شعبوں سے واقف ہیں۔ اپنی لاعلمی کے باوصف اس میدان میں وہ فتویٰ دیتے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ اسلامی معاشیات اور مالیات کے فضلا نے بعض تجرباتی مطالعات پیش کیے ہیں۔

ان کے رویے میں دو بڑی کمیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے کہ ان مطالعات میں ان کا قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کا استعمال محض اندازے پر مبنی ہوتا ہے، جس سے صرف ظنّی علم حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے فتوے کی حیثیت اللہ کے حکم کے برابر ہرگز نہیں ہوتی، بل کہ یہ فتویٰ زیادہ سے زیادہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں ان کی اپنی رائے ہے۔ یہ فضلا ان تجرباتی مطالعات کی موجودگی کا اعتراف تک نہیں کرتے، جو ان کی رائے کے خلاف ہیں۔ چوں کہ یہ فضلا تجرباتی تحقیق کی اہمیت اور کردار سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے یہ ایسے بے بنیاد دعویٰ کرتے ہیں، جن کے پیچھے کوئی تجرباتی ثبوت نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر نفع اور سود دونوں مال دار افراد کو ملیں تو صرف سود پر توجہ دینا بے معنیٰ ہے۔ اسلامی ریاست میں عوامی مالیات کے بارے میں بعض تصورات سادہ لوحی سے عبارت ہیں۔ مثال کے طور پر یہ فرض کرنا بالکل محال ہے کہ حکومت جب بھی مطالبہ کرے، مومنین اپنی دولت اس کے حوالے کر دیں۔ اس طرح زکوٰۃ کی رقم کو ریاست کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ سمجھنا بالکل خیالی معاملہ ہے۔ بالخصوص آج کے مسلم معاشرے میں جہاں اسلام پر عمل برائے نام ہے اور جب کہ یہ بھی اختلافی معاملہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی انفرادی طور پر ہو یا اس کو ادارے کی شکل دی جائے، ریاست کا زکوٰۃ کو ادارے کے طور پر منظّم کرنا کوئی معقول یا عملی طریقہ نہیں ہے۔ بینکوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ریاست کو بلاسودی قرضہ دیں، اس پر اعتراض ہوں گے اور اسلامی مالیاتی ادارے تک اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس پر عمل کرنے سے بینک اپنا محفوظ سرمایہ نکالنے پر مجبور ہوں گے اور عوام بھی بینک سے اپنی رقم واپس لے لیں گے۔ اگر کرنسی نوٹ کو ضرورت کے مطابق جاری کرنا شروع کر دیا گیا تو اس سے پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ بہت سے فقہا اسلامی فقہ کے موضوع پر بے سند تصانیف تحریر کرنے کے عادی ہیں، وہ دیگر موضوعات بھی، مثلاً معاشیات پر ایسی غیر مستند باتیں کرتے ہیں، جب کہ اس میدان میں ان کی مہارت ثابت نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے طرز عمل میں کتاب اور زندگی کے زمینی حقائق دونوں جھلکیں ہم سماجی حقائق کو سمجھیں اور بامعنیٰ انداز میں تبدیلی لائیں۔ مسلمانوں کو تجرباتی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، البتہ اس طرز میں چھپی خامیوں سے بچنا چاہیے۔ تجرباتی طرز میں بنیادی کمی ہے کہ پورا انحصار حواس خمسہ کے تجربے پر کیا جاتا ہے۔ درحقیقت تجرباتی طرز عمل کو اختیار کرنے میں مسلمانوں کے لیے یہی نکتہ رکاوٹ ہے کہ مغربی تجرباتی تصور نہایت محدود ہے، یہ صرف تجربے اور مشاہدے پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس مسئلے کے مالہ وماعلیہ کو بہ خوبی سمجھا جائے، اس کی نوعیت اور دائرۂ کار کا فہم حاصل کیا جائے۔ اس کے لیے استقرائی تحقیق اور مطالعہ درکار ہے۔ مسلمانوں کو نہ صرف سنت نبوی، بل کہ سنت اللہ کا بھی بہ خوبی ادراک ہونا چاہیے۔ اللہ نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، جو تمام قدرتی اور معاشرتی مظاہر پر حاوی ہیں اور قرآن کے مطابق یہ قوانین تبدیل نہیں ہو سکتے۔ (۲۸)

مذکورہ بالا صفحات میں ہم نے اسلامی قانون کے ضمن میں ان تین بنیادی نکات کی نشان دہی کی ہے: الف) قانون کی تشکیل اسلام کے بنیادی مآخذ پر مبنی ہونی چاہیے۔ ب) قانون کو اسلام کے مقاصد اور اقدار کے حوالے سے وضع کرنا چاہیے۔ ج) سماج میں قانون پر عمل شوریٰ کے طرز پر ہونا چاہیے۔ اس باب میں ان شرائط کا مفصل ذکر ہے۔ کوئی قانون حقیقی معنیٰ میں اسی وقت اسلامی ہوسکتا ہے، جب کہ یہ تینوں شرائط پوری ہوں: الف) قانون کی تشکیل اسلام کے بنیادی مآخذ کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور اس بارے میں زندگی کے حقائق اور تجرباتی طریقے کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ ب) اسلام کے مقاصد اور اقدار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ج) قانون کی معاشرے میں تشکیل اور نفاذ شورائی طریقے کی مدد سے ہونا چاہیے۔

باب ہفتم

اختتامیہ: اصلاح حال کی جانب

مسلم دنیا کو اس وقت متعدد مسائل اور سوال درپیش ہیں۔ تیل کے پیش نظر بین الاقوامی قوتوں کی مداخلت کے باعث بعض مسلم ممالک کے عوام سنگین تنازعات کا شکار ہیں۔ دیگر مسلم ممالک میں مخالف قوتوں کا غلبہ ہے۔ مسلم اکثریت کے ممالک میں تعلیم کی کمی اور غربت کی وبا عام ہے۔ اسی طرح مسلکی اختلافات کا مسئلہ ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ خواتین کا جسمانی استحصال صرف مسلم معاشرے ہی میں نہیں، ہر جگہ عام ہے۔ عزت کے نام پر خواتین کا قتل ہوتا ہے۔ بہ ظاہر اسلامی ممالک میں اسلام کے نام پر خواتین کار نہیں چلا سکتیں، حتی کہ ترقی پسند مسلم ممالک میں بھی مسلمان عورت کو ٹیلی فون کے پیغام کے ذریعے تین طلاق دی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں ایسی بہت سی مساجد ہیں، جن میں خواتین کا داخلہ آسان نہیں۔

ان زیادہ تر مسائل کا تعلق موجودہ ثقافتی اور سیاسی صورت حال سے بھی ہے، لیکن فی الوقت مسلم ذہن اور ثقافت پر جمود اور بے عملی طاری ہے۔ روایتی مذہبی تصورات کا قبضہ ہے اور صرف متنی ماخذات پر اصرار حدیثوں اور کبھی کبھی کم زور احادیث کا بہ طور دلیل بے جا استعمال عام ہے۔

شریعت کی موجودہ اصطلاح گم راہ کن ہے، کیوں کہ اس کے متعدد خارجی پہلو ہیں، مثلاً الوہیت، تقدس اور تبدیلی کا نہ ہونا۔ شریعت کو محدود دائرے میں اسلامی قانون کے برابر قرار دینے سے معاشرہ اندھی تقلید کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی مقاصد، اصول اور روح کو نظر انداز کرنے سے معاشرہ حرکیت اور فعالیت سے محروم ہو جاتا ہے اور

لغوی اور مطلق معنیٰ کی کثرت کے باعث عوام کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قرآن تمام مقدس کتابوں کا نقطۂ تکمیل ہے۔ اسلام میں اس کا مقام مرکزی بھی ہے اور بے مقابلہ بھی۔ رسول اللہ ﷺ تک اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ غرض یہ کہ کوئی بھی قانون، عقیدہ یا ضابطۂ قرآنی بنیادوں کے بغیر قابل توجہ نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف سب ہی مسلمان کرتے ہیں، لیکن عملاً اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

سنت نبوی بھی مسلمانوں اور اسلامی طرز زندگی کے لیے اہم ہے۔ قرآن کے مطابق رسول اکرمؐ کا طریقہ مثالی اور قابل تقلید ہے۔ البتہ جیسا کہ باب سوم میں واضح کیا گیا، روایتی مسلم فکر میں حدیث کو بہ طور مآخذ بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اسے قرآن کے برابر حیثیت حاصل ہے اور اس کو اللہ کی ہدایت کا درجہ عطا کیا جاتا ہے۔ اجماع کے بارے میں عام تصورات صحیح نہیں ہیں، بل کہ یہ مبالغہ آمیز ہیں۔ اجماع کی اصطلاح تک کی تعریف طے نہیں ہے۔ اجماع کے کسی بھی پہلو کے بارے میں مکمل اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ متعدد فتاویٰ، جن کے بارے میں اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کا مخصوص سماجی اور تاریخی پس منظر ہے اور ان کا تعلق رسول اکرمؐ اور صحابہ کے دور سے ہے، جب کہ ان کے مخصوص عناصر یا تفصیلات ہر عہد کے لیے اور آفاقی طور پر قابل عمل نہیں ہیں۔

قیاس اسلامی فقہ کا ایسا آلہ ہے، جس کا بے جا استعمال ہوا ہے۔ جو بھی قانون قیاس سے نیا ہے، اس کو اللہ کے قانون کا درجہ نہیں دینا چاہیے اور مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس کو مقدس سمجھیں۔ اسلامی قانون کے سرمائے میں تجرباتی بنیاد کی کمی ہے۔ قانون پر عمل سے قبل اور بعد میں تحقیق کے اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور مسئلے کو سمجھنے اور جائزہ لینے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

کسی بھی قانون کو صرف اسی صورت میں اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے، اگر اس میں مندرجہ ذیل شرائط کا اہتمام ہو: (الف) قانون کی تشکیل بنیادی اسلامی مآخذ پر مبنی ہو اور اس کا تعلق عملی زندگی کے حقائق سے ہو اور تجرباتی طریقۂ کار پر محنت کے ساتھ عمل ہو۔

(ب) یہ قانون اسلام کے مقاصد اور اقدار سے اخذ کیا گیا ہو۔ ج) سماج میں اس قانون پر عمل شورائی طریقے سے ہو۔

تعمیری تبدیلی ایک حرکی اور دل چسپ معاملہ ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں کام یابی کے لیے اسلام ہر شخص سے تعمیری تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس تبدیلی سے ہر سطح پر فرد کی اصلاح ہوتی ہے اور دوسروں پر بھی اس کا مثبت اثر مرتب ہوتا ہے۔ تبدیلی کا عمل اپنے نفس سے شروع ہونا چاہیے۔ ہمیں خود اپنے اندر تبدیلی لانا چاہیے، جو اس تبدیلی میں فعال کردار ادا کرتے ہیں اور رجعت پسندانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کرتے، وہ نہ صرف اپنے آپ میں تبدیلی لاتے ہیں، بل کہ دوسروں میں بھی بہتر تبدیلی لاتے ہیں۔

مصنف کتاب

محمد عمر فاروق مرکز برائے اسلامی مالیات، بحرین انسٹی ٹیوٹ برائے بینکنگ مالیات کے صدر شعبہ ہیں۔اسلامی معاشیات، بینکنگ، مالیات، اسلامی قانون، اسلامی فقہ اور اسلامی سیاسی معاشیات ان کی خاص دل چسپی کے میدان ہیں۔

حواشی

۱۔ M. Asad, This Law of Ours and Other Essays (Gibraltar: Dar Al-Andalus, 1987), p.28.

۲۔ اسلام کے تکثیری اصولوں اور اسلامی ورثے کو مدنظر رکھتے ہوئے، جیسا کہ منشور مدینہ میں وضاحت کی گئی ہے، جو نبی کریم ﷺ کی نگرانی میں تدوین کیا گیا تھا۔ ''مسلم ملک'' کہنے کے بہ جائے ''مسلم اکثریتی ملک'' کی اصطلاح ترجیح دی گئی۔

۳۔ غیر انسانی اور غیر اسلامی عمل سے مزید واقفیت اور تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے:

M.O. Farooq, "Rape and Hudood Ordinance:Perversions of Justice in the Name of Islam," (2006), http://www.islamicity.com/articles/Articles.asp?ref=IC612-3179. (Accessed on June 21, 2007),

A. Quraishi, "Her Honor: An Islamic Critique of the Rape Laws of Pakistan from a Woman-Sensitive Perspective," *Michigan Journal of International Law* (18) (1997), pp. 287-320; A. Jahangir and H. Jilani, *The Hudood Ordinance* (Lahore, Pakistan: Rhotus Books,1990).

۴ Merriam-Webster Dictionary, http://www.m-w.com/dictionary/divine.(Accessed November 29, 2006).

۵۔ ہمیں اصطلاحات کے استعمال میں محتاط رہنا چاہیے۔ جیسے آسمانی اور یہ بالکل واضح ہو کہ عمل و تجربہ میں اس سے کیا مراد ہے؟ اور کس معنی میں استعمال ہوتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کی روایات کو قرآن کے مساوی غیر مختلف فیہ مقام نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن بے مثال اور انفرادی مقام رکھتا ہے، کوئی اس کے مماثل نہیں۔

۶۔ تغير الأحكام بتغير الزمان والمكان۔ M. Zahraa, "Characteristic Features of Islamic Law: Perceptions and Misconceptions," *Arab Law Quarterly* 15 (2) (2000), pp.168-196, بہ حوالہ: ابن القيم الجوزية، اعلام الموقعين عن رب العلمين، بیروت: المكتبة العصرية، ۱۹۸۷، جلد: ۳، ص: ۱۴-۷۰

۷۔ M. O. Farooq, "Rape and Hudood Ordinance: Perversions of Justice in the Name of Islam" (2006).

۸۔ I.A.K. Nyazee, *Islamic Jurisprudence (Usul al-Fiqh)* (Islamabad, Pakistan: Islamic Research Institute, 2000), p.39; also, p.202.

۹۔ M. Khan, "The Priority of Politics," *Boston Review* (April/May 2003), http://www.bostonreview.net/BR28.2/khan.html.(Accessed October 7, 2006).

۱۰۔ M. O. Farooq, "The Spirit of Global Belonging: Perspectives from Some Humanity-Oriented Icons," (2006), http://www.nazrul.org/works_on_nazrul/articles/global-belonging.doc. (Accessed June 21, 2007).

۱۱۔ M. Asad, *This Law of Ours,* pp.30-31.

۱۲۔ M. Y. Guraya, *Islamic Jurisprudence in the Modern World* (Lahore, Pakistan: Sh. Muhammad Ashraf, 1993), p.76.

۱۳۔ اے حسن، (ترجمہ) سنن ابوداؤد (۱۹۹۰)، جلد: ۱، كتاب الأدب، حدیث نمبر ۵۷۰

۱۴۔ ایم ایم خان، (ترجمہ) صحیح بخاری، جلد:۱، حدیث نمبر ۸۲۸

۱۵۔ ایم ایم خان، (ترجمہ) صحیح بخاری، جلد:۹، حدیث نمبر ۲۱۹

۱۶۔ F. Mernissi, *Veil and the Male Elite: A Feminist Interpretation of Women's Rights in Islam* (Reading, Massachusetts: Perseus Books, 1987), pp.49-61,

بہ حوالہ **ابن الاثیر ، اسد الغابة**، جلد:۵، ص:۳۸

۱۷۔ ادارتی نوٹ، مزید دیکھیے: AbdulHamid AbuSulayman, *Apostates, Islam & Freedom of Faith: Change of Conviction Vs Change of Allegiance,* Occasional Paper No. 22, (Malta: IIIT, 2013).

۱۸۔ ایم ایم خان، (ترجمہ) صحیح بخاری، جلد:۹، حدیث نمبر ۵۷، دوسرے مصادر کی فہرست جہاں یہ حدیث مذکور ہے اور اس کے تنقیدی تجزیہ کے لیے دیکھیے:

A. Shafaat, "The Punishment of Apostasy in Islam (Part II): An Examination of the Hadiths on the Subject," http://islamicperspectives.com/PunishmentOfApostasy_Part2.html. (Accessed October 29, 2006).

۱۹۔ ایم ٹی انصاری (ترجمہ تعارف اور حاشیہ کے ساتھ)، سنن ابن ماجہ، نئی دہلی، انڈیا کتاب بھون، ۲۰۰۰، جلد:۵، **کتاب الفتن**، حدیث نمبر:۳۹۵۰، ص:۲۸۲

۲۰۔ بی ایم دیال (ترجمہ تعارف اور حاشیہ کے ساتھ)، **در المختار**، علاء الدین حصکفی، نئی دہلی انڈیا، کتاب بھون، ۱۹۹۲، جلد:۲، ص:۳۵۱ مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب میں قیاس کا باب دیکھیے۔

۲۱۔ M. Muslehuddin, *Philosophy of Islamic Law and the Orientalists* (New Delhi, India: Taj Company, 1986), p.140

۲۲۔ A. AbuSulayman, *The Islamic Theory of International Relations: New Directions for Islamic Methodology and Thought* (Herndon, Virginia: International Institute of Islamic Thought, 1987) p.66.

۲۳۔ N. Shehaby, "Illa and Qiyas in Early Islamic Legal Theory," *Journal of American Oriental Society* 102 (1) (Jan-Mar, 1982), pp.27-46.

۲۴۔ ہدایہ کا ترجمہ جہاں سے یہ اقتباس ماخوذ ہے، وہ ناقص ہے اور متروک انگریزی میں مرتب کیا گیا ہے۔ مزید کچھ اصطلاحات اور اسما کا ترجمہ آسانی سے قابل شناخت نہیں ہے۔ اسی لیے اس کے قائم مقام الفاظ اور اشاعت اس یقین دہانی کے لیے اضافہ کیے گئے ہیں کہ مسئلے میں وہ عبارت زیادہ قابل فہم ہو جائیں۔

۲۵۔ C. Hamilton, *The Hedaya or Guide: A Commentary on the Mussulman Laws,* (trans., with introduction and notes) by Al-Marghinani, 2nd edn. (Karachi, Pakistan: Darul Ishaat, 1989), p.110.

۲۶۔ انصاری، (ترجمہ) سنن ابن ماجہ، جلد: ۳، حدیث نمبر، ۱۹۶۸

۲۷۔ C. Hamilton, (trans.), The Hedaya, 1989, p.1

۲۸۔ M.O. Farooq, "Development Demystified: An Islamic Perspective," Paper Presented at the First Conference of NAAMPS, April 9-11, 1993, Chicago, Illinois

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی مختصر کتابوں کا سلسلہ ادارے کی اہم اشاعتوں کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے، جنھیں خلاصے کی شکل میں اس لیے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کو اصل کتاب کے اہم مضامین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہوجائے۔

یہ کتاب اِس موضوع پر گفتگو کرتی ہے کہ کس طرح مسلم امت کا ذہن ودماغ اسلامی عمومی اقدار کے سلسلے میں کم زور پڑ گیا یا اُن سے پوری طرح دور ہوگیا۔ اِس کتاب میں بہت مضبوطی کے ساتھ ''مبنی بر اقدار نقطۂ نظر'' کی طرف واپسی کی وکالت کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شریعت کی اصل شکل وقت کے ساتھ ساتھ بھول بھلیاں میں بھٹک کر رہ گئی، جس سے مسلم ارتقا کی راہ کھوگئی۔ کتاب میں خاص طور پر اسلام کے قوانینِ حدود کی طرف اشارے کرکے بعض احادیث کے متعلق ابھرنے والے سوالات کو موضوع بنایا گیا ہے اور قرآن وحدیث کی اصل روح کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ عبدالحنان (سابق چیئرمین اسلامی بینک بنگلہ دیش وسابق ڈپٹی گورنر بنگلہ دیش بینک)

یہ کتاب اسلامی قانون کے متعلق قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے اصل مآخذ سے استفادہ کرکے تیار کی گئی ہے۔ مصنف نے اِن مآخذ کی روشنی میں تعریفات کے تعین پر اچھی گفتگو کی ہے اور اس بات پر خصوصی روشنی ڈالی ہے کہ مبنی بر اقدار منہج ہی اسلامی قانون کے ارتقا کا ضامن ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف صدیقی (شعبۂ تاریخ واسلامی تہذیب، شارجہ یونی ورسٹی، یو اے ای)

یہ کتاب ایک شاندار تجزیے پر مشتمل ہے اور معاصر مسلم دنیا کے متعلق اہم اشارات رکھتی ہے۔

Al-Ittehad Publications Pvt. Ltd

Al Ittehad Publication Pvt. Ltd.

B-35 (LGF), Nizamuddin West, New Delhi-110013

Ph.: +91-11-41827475, 24352732, 24352048

e-mail.: alittehad@gmail.com

978-93-80946-39-9